بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان القرآن کے گذشتہ شمارے میں ابوالعرفان صاحب کا مضمون "پاکستان میں زکوٰۃ کی متوقع آمدنی" اس اُمید پر شائع کیا گیا تھا کہ قومی مالیات کے ماہرین اور فقہ اسلامی میں گہری بصیرت رکھنے والے اہلِ علم حضرات فاضل مضمون نگار کی توضیحات پر اظہارِ خیال کرکے فکر و نظر کے نئے گوشے اور عملی مسائل کے نئے پہلو سامنے لائیں گے۔ مگر افسوس اس سلسلہ میں آج تک جس قدر خطوط موصول ہوئے ہیں ان میں سوائے یاس و قنوطیت اور طنز و تعریض کے کوئی چیز سامنے نہیں آئی۔ ان خطوط کا لبِ لباب یہ ہے کہ اس ملک میں زکوٰۃ کا نظام آخر کس طرح کامیابی کے ساتھ نافذ کیا جا سکتا ہے جب کہ ہمارے ہاں دیانت دار اور نیک افراد کا خوفناک قحط پایا جاتا ہے؟ کیا پختہ سیرت و کردار رکھنے والے لوگوں کی کمی سے یہ نظام یکسر ناکام نہ ہو جائے گا؟ اس لیے بہتر یہی ہے کہ یہ نظام جس صورت میں چل رہا ہے اسے اسی نہج پر چلنے دیا جائے۔

نظامِ زکوٰۃ ہی کے بارے میں نہیں بلکہ نظامِ شریعت کے عملی نفاذ کے بارے میں بھی نہ صرف کم تعلیم یافتہ بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے حلقوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً اسی قسم کے خدشات کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں اگر اسلامی نظام کے نفاذ کا اعلان کر دیا جائے تو حالات روبہ اصلاح ہونے کے بجائے ابتر ہوں گے اور اس طرح لوگ اللہ کے دین سے بدظن ہو جائیں گے۔ اس بنا پر اسلامی نظام کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ کتابوں اور وعظوں ہی تک محدود رہے اور میدانِ عمل میں اسے اُتارنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ یہاں اس کی کامیابی کا کوئی امکان

موجود نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی اعتبار سے قوم کے اندر زبردست بگاڑ پیدا ہو چکا ہے، جس کے بھیانک مناظر زندگی کے ہر شعبے میں دیکھے جا سکتے ہیں لیکن اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے باوجود ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ قوم کے ایک وسیع حلقے کے اندر برائی سے نجات حاصل کرنے اور بھلائی کو قبول کرنے کی آرزو موجود ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس ملک کی عظیم اکثریت نظام مصطفیٰ کے نعرے پر لبیک کہتے ہوئے بھٹو آمریت کے مصائب و شدائد سہنے پر کیونکر آمادہ ہو سکتی تھی؟ اس تحریک میں جن لوگوں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خدا کے حضور میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا، جنہوں نے بڑی ہمت و پامردی سے ہر قسم کے استبداد اور درندگی کا مقابلہ کیا، ان میں سے ایک فیصد افراد بھی ایسے نہ تھے جن کے دل کے کسی گوشے میں ادنیٰ سی خواہش بھی موجود تھی کہ وہ بھٹو کو ہٹا کر خود تخت اقتدار پر فائز ہوں۔ انھوں نے یہ عظیم قربانیاں صرف اس مقصد کے لیے دیں کہ اس ملک کی عنانِ اختیار اُن لوگوں کے ہاتھ میں آئے جو یہاں اللہ کے دین کو عملاً نافذ کر دیں۔ جس معاشرے میں اسلام کے ساتھ لوگوں کا اس طرح کا جذباتی لگاؤ موجود ہو اس میں اسلامی نظام کے قیام کے بارے میں مایوسی و ناامیدی کوئی صحت مند رجحان نہیں۔

اس سلسلہ میں اگر کوئی چیز موجب پریشانی ہے تو صرف یہ کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اسلام کے ساتھ اکثریت کی دلی وابستگی اور اس وابستگی کے نتیجے میں اس کے لیے بیش بہا قربانیاں رنگ نہیں لاتیں؟ اور اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی آرزو، آرزو ہی رہتی ہے، شرمندۂ تکمیل نہیں ہونے پاتی؟ اسلام کے نقطۂ نظر سے پاکستان دَورِ حاضر کی بیک وقت سب سے زیادہ خوش قسمت اور سب سے زیادہ بدقسمت مملکت ہے۔ خوش قسمت اس اعتبار سے کہ اسے اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے حاصل کیا گیا اور اسی مقصد کی خاطر یہاں بار بار منظم کوششیں ہوئیں، تحریکیں چلیں اور اربابِ اقتدار کے خلاف عوام نے بھرپور جدوجہد کی۔ اس ساری تگ و تاز سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ عوام اس نظام کو غالب کرنے کی دل میں سچی تڑپ رکھتے ہیں۔ یہ اس ارضِ پاک کی تاریخ کا سب سے تابناک پہلو،

کہ عہدِ حاضر میں جب کہ پوری دنیا میں لادین ریاستوں کا غلبہ ہے، پاکستان ہی وہ واحد ریاست ہے جس میں اسلام کی عملداری قائم کرنے کے لیے جدوجہد کی جا رہی ہے۔ رہا اس مملکت کی بدقسمتی کا پہلو تو وہ یہ ہے کہ یہ ملک جو اپنے وجود تک کے لیے اسلام کا رہینِ منت ہے یہاں دینِ حق کے عملی نفاذ کی ساری کاوشیں یکے بعد دیگرے ناکام ہو رہی ہیں۔ جو سرزمین لوگوں کی اُمیدوں کا گہوارہ ہو، وہ اگر اُن کی اُمنگوں کا پیہم مدفن بنتی رہے تو اس سے انہیں جس قدر شدید ذہنی اذیت پہنچتی ہے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سخت کوشش کے بعد ناکامی یوں بھی زندگی کا بڑا اعصاب شکن تجربہ ہے۔ لیکن جب ناکامی بھی منزل کے بالکل قریب پہنچ کر ہو اور بار بار ہو، تو اس سے افراد اور قوموں کے اعصاب مفلوج اور اُن کے عزائم اور ارادے بالکل مضمحل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے اس ملک کے جو رہنما اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ وہ جب چاہیں گے اسلام کے نام پر قوم کو اپنے پیچھے لگا لیں گے، وہ جس قدر جلدی اس غلط فہمی کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیں اسی قدر ان کے حق میں مفید ہے۔ اس ضمن میں انہیں تین چار باتوں پر خاص طور پر غور کرنا چاہیے۔

پہلی بات جس پر ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کی اشد ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ کیا ہمارے رہنما اسلامی نظام کے قیام میں مخلص اور یکسو ہیں اور یہی اُن سب کا منتہائے مقصود ہے اور اس نظام کی عملداری ہی میں وہ نہ صرف اہلِ پاکستان کی بلکہ پوری نوعِ بشری کی فلاح پاتے ہیں یا اُن کی دل بستگی کچھ دوسرے نظامہائے حیات سے ہے مگر ملک کی جذباتی فضا کو دیکھتے ہوئے وہ اسلامی نظام کے ساتھ اپنے تعلقِ خاطر کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں؟ یا وہ اسلامی نظام کے چند اجزا لے کر اور ان کے ساتھ دوسرے نظاموں کے کچھ اجزا شامل کر کے پاکستان کے لیے اسلوبِ حیات کا ایک نیا مرکب تیار کرنا چاہتے ہیں؟ یا اُن کی زبانوں پر نعرہ تو نظامِ مصطفےٰ کا ہوتا ہے لیکن ذہنوں میں اس نظام کا وہ کوئی ایسا نقشہ رکھتے ہیں جو اُس نقشے سے تو مختلف ہے جس کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے اجتماعی زندگی کی تشکیل کی تھی اور دورِ حاضر کی بعض مغربی ریاستوں کا چربہ ہے۔ اس ملت کے رہنماؤں کو یہ بات پوری طرح ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ عوام کو صرف اسلامی نظام کے نام ہی سے گہری عقیدت اور وابستگی نہیں بلکہ وہ اس بات کے بھی آرزومند ہیں کہ

ہمارے ملک میں جب اس نظام کا نفاذ ہو تو اس کے خدوخال بھی بالکل وہی ہوں جو ہمیں خلافتِ راشدہ کے دَور میں نظر آتے ہیں اور اس سے ہمیں سعادت کے وہی ثمرات حاصل ہوں جو اس مبارک دَور میں مسلمانوں کو حاصل ہوتے تھے۔ چنانچہ مسلم قوم کی عظیم اکثریت اسلامی نظام کی ایسی کوئی تعبیر یا اس کے کسی ایسے عملی ڈھانچے کو قبول کرنے پر ہرگز آمادہ نہیں ہو سکتی جو اس مثالی نظام سے مغائرت رکھتا ہو یا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نافذ کیا تھا۔ پاکستان کے مسلمان اپنے ذہنوں میں اسلامی نظام کا ایک مخصوص تصور رکھتے ہیں جو انہیں نسلاً بعد نسلٍ ایک مقدس امانت کے طور پر خلافت راشدہ سے منتقل ہوا ہے۔ اس لیے جب ان کے سامنے اس نظام کی کوئی ایسی تصویر لائی جاتی ہے جو اشتراکیت اور مغربی جمہوریت سے مماثلت رکھتی ہو تو وہ وحشت زدہ ہو کر پوچھتے ہیں کہ ہمیں اسلام کے نام پر کس عذاب کی طرف دھکیلا جا رہا ہے؟ جب عوام پر اسلام کے فقہی مسالک کا اختلاف شاق گذرتا ہے تو وہ اسلام کی ان متضاد تعبیروں کو آخر کس طرح گوارہ کر سکتے ہیں جو امیروں کے نظامِ مصطفٰے اور غریبوں کے نظامِ مصطفٰے کی صورت میں کی جا رہی ہیں؟ مسلم عوام کے نزدیک نظامِ مصطفٰے ایک ہی ہے اور اس کی وہی صورت صحیح اور معتبر ہے جس کی سند ہمیں عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ سے ملی ہے۔ اس کے علاوہ دینِ حق کی جس قدر دیگر تعبیریں ہیں وہ بالکل غلط اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔ مسلم معاشرے کا اجتماعی ضمیر ان میں سے کسی کو بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔

اس بنا پر مسلم قوم کے رہنماؤں کے لیے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اسلامی نظام کے قیام کے بارے میں بالکل مخلص ہوں بلکہ اس نظام کے مثالی نقشہ کے متعلق بھی یکسو ہوں جو انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے ملا ہے۔ اس معاملے میں ان کی ژولیدہ فکری خود ان کے لیے اور ملک و ملت کے لیے ہر لحاظ سے مہلک ہے۔

دوسرے ہمارے رہنماؤں کے ذہن میں یہ بات بھی رہنی چاہیے کہ اسلام سے ان کی محبت و عقیدت کے دعوے اگرچہ عوام کے لیے ماضی میں بڑی کشش رکھتے تھے مگر اب وہ کشش بتدریج کم ہو رہی ہے۔ اسلام کو اس ملک کی غالب قوت بنانے میں انہیں بار بار جس ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے اس سے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اس ناکامی کے دیگر اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ان کے رہبر جس دینِ حق کی

محبت کے دعویدار ہیں ان کی عملی زندگیاں ان کے اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتیں۔ اسلام کوئی پیکرِ خیالی نہیں جس کی جھلک زندگی کے عملی شعبے میں نہ دیکھی جا سکتی ہو بلکہ یہ ایسا نظامِ فکر و عمل ہے جو انسان کی پوری زندگی کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا داعی بھی ہو اور اس دعوت پر وہ عوام کو اپنے اِرد گرد جمع کر کے ان سے ہر قسم کے ایثار اور قربانی کا مطالبہ کرے مگر وہ خود اسلام کے کم سے کم مطالبات پورے کرنے پر بھی آمادہ نہ ہو تو عوام دینِ حق کے ساتھ اس کے دعوائے محبت پر کب تک اعتبار کرتے رہیں گے؟ کیا وہ یہ سوچنے میں کسی قدر حق بجانب نہ ہوں گے کہ اسلام کا جو شیدائی اور اسلامی نظام کے قیام کا جو علمبردار اپنی زندگی کے خاکے میں اس مقدس نظام کے رنگ بھرنے کے لیے تیار نہیں وہ اسے پورے ملک میں کیسے نافذ کرے گا؟ کسی ارفع و اعلیٰ نظریۂ حیات سے تعلقِ خاطر کا دعویٰ بھی بذاتِ خود قابلِ قدر ہے لیکن اگر اس تعلقِ خاطر کی تصدیق عملی اقدام سے نہ ہو تو یہ دعویٰ کچھ مدت کے بعد اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔

تیسری چیز جو ہمارے رہنماؤں کے غور و فکر کی محتاج ہے وہ یہ ہے کہ اگر وہ قوم سے مکمل اتفاق و اتحاد اور جان نثاری کا مطالبہ کرتے ہیں اور انہیں یہ حقیقت ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جب تک وہ اپنے اندر یہ صفات پیدا نہیں کرتے اُس وقت تک اُن کی کشتی ساحلِ مراد تک نہیں پہنچ سکتی، تو آخر وہ خود بلند حوصلگی، عالی ظرفی اور ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف خوش دلی سے دستِ تعاون بڑھانے سے کیوں گریزاں ہیں؟ کیا انہیں اس بات کا احساس نہیں کہ ان کی چھوٹی چھوٹی باہمی رنجشیں قوم کے اندر زبردست انتشار پیدا کرتی ہیں؟ جن لوگوں نے انسانی نفسیات کا مطالعہ کیا ہے اُن کی رائے یہ ہے کہ زندگی میں اصولی معاملات بہت ہی کم ہوتے ہیں — انسان کو زیادہ تر عملی مسائل سے سابقہ پیش آتا ہے جنہیں اگر نیت بخیر ہو تو تدبر اور فراخدلی کے ساتھ بآسانی حل کیا جا سکتا ہے۔ جن باتوں کو ہم اصولوں کا اختلاف کہہ کر ایک دوسرے سے کٹتے بلکہ ایک دوسرے کے درپے آزار ہوتے ہیں وہ درحقیقت انسان کی انا کے مسائل ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہم میں اس بات کی ہمت اور جرأت نہیں ہوتی کہ ہم اس افسوسناک صورتِ حال کو بطور حقیقت تسلیم کر لیں کیونکہ اس سے ہمارے اخلاص اور بے لوثی پر حرف آتا ہے اس لیے ہم انا کے ٹکراؤ کو اصولوں کے اختلاف کہہ کر اپنے اخلاص کا بھرم قائم رکھنے کی

کوشش کرتے ہیں۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب ہمارے مفادات کا تقاضا کسی فرد، گروہ یا جماعت کے ساتھ اتفاق و اتحاد کا ہو تو ہم بڑے سے بڑے اختلاف کو نظر انداز کرکے اُس کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی سعی کرتے ہیں لیکن اگر وہ مفادات باقی نہ رہیں تو پھر اس اتحاد سے گریز کی راہیں ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ ایک با اصول آدمی کے لیے ضروری ہے کہ کسی فریق کے ساتھ اصولوں پر سمجھوتہ نہ کرے لیکن اُسے ہر فیصلہ کُن مرحلہ پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ جس بات کو وہ اپنے ذہن کے مطابق اصول کا معاملہ قرار دے کر غیر مصالحانہ رویہ اختیار کر رہا ہے وہ سرے سے اصول کا معاملہ ہی نہ ہو بلکہ اس کی انانیت نے کسی عملی اقدام کو اصول کا مسئلہ بنا کر اس کی قدر و منزلت کو غیر معمولی حد تک بڑھانے کی کوشش کی ہو۔ اصول بال سے باریک پل صراط نہیں جس پر سے ایک قدم اِدھر یا اُدھر انسان کو جہنم رسید کرسکتا ہے بلکہ اصول ایک وسیع دائرہ ہوتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے انسان حالات کے مطابق توافق و تعاون کی راہیں نکالتا ہے۔ لیکن انسان کی بدقسمتی یہ ہے کہ جب وہ اپنے حالات کے پیشِ نظر اپنے لیے کوئی الگ راہ اختیار کرتا ہے تو اپنے طرزِ عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اپنے آپ کو اصول پرست بنا کر پیش کرتا ہے۔ چنانچہ جو حضرات اِس قوم کی رہنمائی کا عزم لے کر اُٹھے ہیں انہیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ان کی بے غرضی و بے نفسی، اُن کے جذبۂ اتحاد و ایثار کو دیکھ کر ہی قوم کے اندر یہ صفات پیدا ہوں گی اور اگر خود ان کی زندگیاں ان اعلیٰ صفات کا مظہر نہیں بنتیں تو پھر عوام سے یہ توقع رکھنا کہ اُن کا طرزِ عمل ان صفات کا آئینہ دار ہو محض خیالِ خام ہے۔

مسلم عوام کا دینی جذبہ ایک پائیدار اور بامقصد قوت میں ڈھل کر اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کرنے میں جو بار بار ناکام ہو رہا ہے تو اُس کی ایک وجہ عامۃ الناس اور رہنماؤں کے مابین مستقل ربط و ضبط کی افسوسناک حد تک کمی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان کے عمل کا محرک رضائے الٰہی کا حصول ہے اور اسی کی خاطر وہ لوگوں کی مدح و ستائش سے بے نیاز ہو کر بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان چونکہ فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے اس لیے اس کے اندر یہ خواہش ہمیشہ موجود رہتی ہے کہ جن لوگوں کے ہمرکاب ہو کر وہ جدوجہد کر رہا ہے اور جن افراد کی قیادت میں قدم بہ قدم منزل کی طرف بڑھ رہا ہے وہ ہر گام پر اس کے خیر خواہ اور

دمساز ہوں اور اُس کے دُکھ درد میں شریک ہوں تاکہ وہ کسی مرحلہ پر بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کرے۔ سیاسی اور دینی جماعتوں میں جہاں کارکن کسی لالچ کے بغیر محض مقصد کی محبت میں سرشار اپنے قائدین کے اشاروں پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار رہوں وہاں وہ کسی طور پر بھی یہ طرزِ عمل برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے ساتھ ان کے رہنما محکوموں کا سا برتاؤ کریں۔ اُن کے اندر فطری طور پر یہ خواہش موجود رہتی ہے کہ وہ اگر اپنے قائدین پر جان نثار کریں تو اُن کے سربراہ بھی اُن کے دلسوز فدائی بنیں اور انہیں اپنی ذات پر ترجیح دیں اور خوشی اور غم کسی حال میں بھی انہیں فراموش نہ کریں ۔ اس اندوہناک حقیقت سے آخر کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے کہ لاتعداد مخلص، ایثار پیشہ اور بہادر کارکن محض رہنماؤں کی سرد مہری کی وجہ سے مختلف میدانوں میں اجتماعی جدوجہد سے الگ ہو کر بیٹھ گئے جس سے اس جدوجہد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ عام انسانوں میں ہوش پر جوش غالب رہتا ہے ۔ مگر یہی لوگ تحریک کا بہت بڑا سرمایہ ہوتے ہیں۔ انہیں نہ تو کسی منصب کا لالچ ہوتا ہے نہ روپے پیسے کی آرزو ۔ وہ صرف مناسب حوصلہ افزائی کے خواہش مند ہوتے ہیں اور اگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو تو وہ یاس و قنوطیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر اُن کی یہ آرزو بھی کوئی ایسی آرزو نہیں جسے پورا کرنے میں قائدین کو ہفت خواں طے کرنے پڑیں۔ محبت اور پیار کے چند جملوں سے وہ اُن کے دل بڑی آسانی سے موہ سکتے ہیں اور اُن کے اندر باطل کے خلاف لڑنے کا عزمِ صمیم پیدا کر سکتے ہیں۔

ایک اور چیز جس کی طرف اس قوم کے کارپردازوں کو خاص طور پر توجہ دینی چاہیے وہ کارکنوں کی صحیح تربیت کا مسئلہ ہے۔ انسان بسا اوقات اِن کے متضاد طرزِ عمل کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ وہ کارکن جو ایک وقت میں ہر قسم کے خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے مردانہ وار جبر و استبداد کی قوتوں سے جا ٹکراتے ہیں دوسرے وقت میں نفس کی کسی ادنیٰ خواہش پر غلبہ حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ کارکنوں کی صحیح تربیت نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے طرزِ فکر میں اُلجھاؤ اور طرزِ عمل میں ناہمواری رہتی ہے جن کی وجہ سے اُن کی صلاحیتیں نہ تو پوری طرح بارآور ہوتی ہیں اور نہ صحیح طور پر بروئے کار آتی ہیں۔ ہنگامی حالات میں اُن کے جذبات کے اندر غیر معمولی تلاطم پیدا ہوتا ہے اور وہ سیلاب کی صورت میں بہہ نکلتے ہیں۔ لیکن جب حالات قدرے پُرسکون ہونے (باقی بر صفحہ ۴۸)

(بقیہ اشارات) کی وجہ سے کسی خاموش تعمیری کام کے متقاضی ہوں تو جوشیلے کارکن ہمت ہار بیٹھتے ہیں کیونکہ اُن کے ذہن غیر ہنگامی کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے درآنحالیکہ قوموں کی ترقی میں ہنگامی مہمات سے بڑھ کر غیر ہنگامی کاموں کی اہمیت ہوتی ہے، تعمیر کا بیشتر حصّہ ان خاموش کاموں ہی کا رہین منّت ہوتا ہے۔ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے ہی بلاشبہ تنور کو گرم کرتے ہیں لیکن یہ روٹیاں پکانے کے لیے کسی اعتبار سے موزوں نہیں ہوتے۔ روٹیاں تو ہلکی آنچ ہی میں صحیح طور پہ پکتی اور تیار ہوتی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ کارکنوں کی تربیت کا کام افراتفری کے عالم میں تو نہیں کیا جا سکتا۔ اُسے پُرسکون ماحول ہی میں کامیابی کے ساتھ سرانجام دیا جا سکتا ہے اور اُسے انجام دینے کے لیے ایسے مربی رہنماؤں کی ضرورت ہے جن کے ساتھ کارکنوں کو گہری محبت اور عقیدت ہو اور وہ دلسوزی بے لوثی، حکمت اور دانائی کے ساتھ اس مقدس فرض کو ادا کریں۔ جب رہنما ہنگامی ضروریات کے تحت کارکنوں کے جذبات مشتعل کر کے اُن سے کام لے لیتے ہیں اور بعد میں نہ تو اُن سے ربط و ضبط رکھتے ہیں اور نہ اُن کی تربیت کی فکر کرتے ہیں تو کارکنوں کے ذہنوں میں قدرتی طور پہ یہ احساس اُبھرتا ہے کہ انہیں اُن کے "آقا" جب چاہتے ہیں حسبِ ضرورت استعمال کرتے ہیں اور بعد میں اُن سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ رہنماؤں کے بارے میں کسی ملک کے عوام کی یہ بدگمانی اُس کے لیے خطرے کا الارم ہے۔